Fikr-o-Nasar (Islamabad) 6:9 (1969)

سرسیّد احمد خان کے مذہبی خیالات

تحریر :- مظہرالدّین صدّیقی ترجمہ :- مظہرالحق

[سرسیّد کے "مذہبی نظام فکر" کی یہ روداد خود اُن کے الفاظ میں دی گئی ہے۔ مضمون نگار کو اس سے اختلاف ہے جس کا کہ مضمون کے آخر میں اظہار کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نے اس پر محاکمہ کیا ہے۔ (مدیر)]

سرسید احمد خان کے مذہبی نظام فکر کا بنیادی تصور یہ معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں پروٹیسٹنٹ مذہب کی تحریک اصلاح کے خطوط پر اسلامی دنیا کی از سرِ نو تشکیل کی جائے۔ اُنہوں نے ہندوستان میں مسلم معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اُٹھایا اور اس مقصد کے لئے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ شائع کیا۔ اس رسالہ کا انداز "اسپیکٹیٹر" اور "ٹیٹلر" کا سا تھا جنہیں اسٹیل اور اڈیسن انگلستان میں نکالتے تھے۔ "تہذیب الاخلاق" میں مذہبی مباحث نہیں چھیڑے جاتے تھے بلکہ مسلمانوں کی روایتوں اور عادتوں پر عقلی اور افادی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہوتا تھا۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا سرسید کو یہ محسوس ہوتا گیا کہ مذہبی مباحث سے دامن بچانا ناگزیر ہے۔ بقول ان کے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں تمام رسمیں اور عادتیں مذہب سے ایسی مل گئی ہیں کہ بغیر مذہبی بحث کے ایک قدم بھی تہذیب و شائستگی کی راہ میں نہیں چل سکتے (۱)۔ جس بات کو کہو کہ چھوڑ دو فوراً جواب ملے گا کہ مذہباً منع ہے۔ مذہبی بحث کا ایک عجیب سلسلہ ہے کہ ایک چھوٹی سی بات پر بحث کرنے کے لئے بڑے بڑے مسائل اور اصولِ مذہب بحث میں آ جاتے ہیں اور اس لئے لاچار کبھی فقہ سے بحث کرنی پڑتی ہے اور کبھی اصولِ فقہ سے۔ اور کبھی حدیث سے بحث کرنی ہوتی ہے اور کبھی اصولِ حدیث سے اور کبھی تفسیر سے بحث کرنی پڑتی ہے اور کبھی اصولِ تفسیر سے۔ پس ہندوستان میں صرف اسٹیل اور اڈیسن ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مقدس لوتھر کی بھی بہت بڑی حاجت ہے (۲)۔

اس سلسلہ میں وہ یہ حقیقت بیان کرتے ہیں کہ اہلِ سنت والجماعت دو فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں جن میں ایک فرقہ یہودیوں کی مانند ہے اور دوسرا رومن کیتھولک کی طرح۔ یہ دو فرقے القاب وہابی و بدعتی سے ملقب ہیں۔ پہلے حضرات بلاشبہ عقائد میں نہایت درست اور قریب حق کے ہیں الاّ ظاہری افعال اور سختی اور سنگدلی اور قساوتِ قلبی اور تعصب پر اس قدر سرگرم ہیں کہ اندرونی نیکی ایک بھی ان میں نہیں رہی اور ٹھیک وہی حال ہے

جو علماءِ یہود کا تھا[1] جو دن رات ظاہری رسومات مذہبی میں مبتلا رہتے تھے اور دوسرے حضرات اگرچہ اندرونی نیکیوں کی جانب کسی قدر متوجہ ہیں الا رسوم آبائی کے اس قدر پابند ہیں اور بدعات محدثہ کے اس قدر پیرو ہیں کہ رومن کیتھولک کے قدم بقدم ہو گئے ہیں بلکہ ان کو بھی مات کر دیا ہے (۳) ــــــــــ وہ لکھتے ہیں:۔

"پس یہ دونوں باتیں ہمارے مقصود کی مارج ہیں اور ہم ان دونوں باتوں کو اپنے سچے دل سے مذہبِ اسلام کے برخلاف سمجھتے ہیں اور ترقی تہذیب مسلمانوں کا بھی مانعِ قوی جانتے ہیں اور اس لئے مسلمانوں میں جہاں تک کہ یہودیت اور کیتھولکیت آگئی ہے اس کو مٹانا اور دُور کرنا چاہتے ہیں" (۴)۔

اسی نہج پر لکھتے ہوئے وہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ہم مسلمانوں میں بہت سے پرانے قصے یہودیوں کے اور بہت سی باتیں اور اعتقادات رومن کیتھولک کے جو ایک قدیم عیسائی فرقہ ہے اور جو مدت سے عرب میں بھی موجود تھا اور بے شمار رسمیں اور عادتیں ہندوؤں کی مل گئی ہیں اور مزید برآں بہت سی باتیں خود ہماری طبیعتوں یا ہماری غلط فہمیوں نے پیدا کی ہیں جو دراصل مذہبِ اسلام نہیں ہیں اور اسی سبب سے مسلمانوں کی عجیب حالت ہو گئی ہے (۵)۔

ان حالات میں وہ یقین رکھتے ہیں کہ بغیر سچا اسلام بے میل اختیار کئے کسی چیز کی بھلائی ممکن نہیں۔ وہ شکایت کرتے ہیں کہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کی رسم و رواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخرالزمان محمد رسول اللہ کے سوا اور بہت سے پیغمبر پیدا کئے ہیں ــ کتاب اللہ کے سوا انسانوں کی بنائی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے۔ "ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسے ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جدِ امجد ابراہیمؑ اپنے باپ آذر کے بتوں کے توڑنے والے تھے۔ ہم سچے خدائے واحد ذوالجلال کا جلال اور پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنی چاہتے ہیں" (۶)۔

ان تحریروں سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ "سچے اور بے میل" اسلام کے متعلق ان کا کیا نظریہ ہے۔ ان کے بعض مقالات سے اور ان کے سوانح نگار مولانا حالی کے ان کے مذہبی عقائد کے بارے میں بعض بیانات سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ ان تمام باتوں کو اسلام کے دائرہ سے خارج سمجھتے تھے جو فقہاء، مجتہدین، مفسرین، اہل الکلام اور صوفیوں کی کوششوں سے عقائد اور اعمال کا جزء بن گئے ہیں۔ وہ صرف قرآن مجید کو مانتے

[1] ظاہر ہے سرسید کا یہ اپنے دور کا مشاہدہ ہے۔ (مدیر)

تھے اور ان معتبر احادیث کو جو درایت کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہوں۔ بالفاظ دیگر ان کے خیالات "اہلِ قرآن" سے ملتے جلتے معلوم ہوتے ہیں مگر بعض دوسرے مواقع پر وہ انتہائی تجدّد پسند نظر آتے ہیں۔ ہم آگے چل کر اس مضمون میں ان کے ان خیالات پر روشنی ڈالیں گے۔

ان کے سوانح نگار مولانا حالی لکھتے ہیں:۔ اس امر کے متعلق انھوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ اسلام کے متعارف مجموعے میں سے وہ حصہ جس کو تمام مسلمان مسلّم من عند اللہ سمجھتے ہیں اور جس کی نسبت یقین رکھتے ہیں کہ وہ جس طرح خدا کی طرف سے نبی آخر الزمانؐ کے دل میں القا ہوا ہے اسی طرح بے کم و کاست نبیؐ سے ہاتھوں ہاتھوں ہم تک پہنچا ہے صرف وہی حصہ اس بات کا استحقاق رکھتا ہے کہ اس میں جو بات مسائل فلسفہ و حکمت کے خلاف معلوم ہو اس میں اور مسائلِ حکمت میں تطبیق کی جائے یا مسائلِ حکمیہ کی غلطی ثابت کی جائے (۷)۔ پس اُنہوں نے جیسا کہ حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ "حسبنا کتاب اللہ" اپنے جدید علمِ کلام کا موضوع اور اسلام کا حقیقی مصداق محض قرآن مجید کو قرار دیا۔ اور اس کے سوا تمام مجموعۂ احادیث کو اس دلیل سے کہ ان میں کوئی حدیث مثل قرآن کے قطعی الثبوت نہیں ہے اور تمام علماء اور مفسرین کے اقوال و آراء اور تمام فقہاء و مجتہدین کے قیاسات و اجتہادات کو اس بنا پر کہ ان کے جواب دہ خود علماء و مفسرین، فقہاء و مجتہدین ہیں نہ کہ اسلام اپنی بحث سے خارج کر دیا۔

وہ یقین رکھتے ہیں کہ قرآن مجید کے احکام ناقابلِ ترمیم و تبدیل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید بطور قواعد کلیہ کے ایسے عمدہ اصول پر نازل ہوا ہے کہ کسی زمانہ میں بھی اس کی ترمیم کی حاجت نہیں ہے۔ ہاں بلاشبہ علماء نے جو اپنے اجتہاد یا رائے سے جو مسئلے قائم کئے وہ محدود ہیں اور شاید ان میں غلطی بھی ہے اور وہی قابلِ ترمیم ہیں مگر ان مسائل کے قابلِ ترمیم ہونے سے قرآن مجید کو قابلِ ترمیم سمجھنا غلطی ہے (۸)۔

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ان کا خیال ہے کہ رسول اللہؐ کی زیادہ تر حدیثیں بعد میں آنے والے لوگوں تک لفظ بلفظ نہیں پہنچیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "ان روایتوں سے بخوبی ظاہر ہے کہ ابتداء یعنی صحابہ و تابعین کے زمانے سے حدیث کی روایت بالمعنی کرنے کا دستور تھا اور جو حدیثیں صحاح ستہ اور دیگر کتب حدیث میں لکھی ہیں سوائے شاذ و نادر چھوٹی حدیثوں کے وہ سب بالمعنی روایت کی گئی ہیں یعنی آنحضرتؐ نے جو بات جن لفظوں سے فرمائی تھی وہ لفظ بعینہٖ و بجنسہٖ نہیں ہیں بلکہ راویوں نے جو مطلب سمجھا اس کو ان لفظوں میں جن میں وہ بیان کر سکتے تھے کیا۔ پھر اسی طرح دوسرے راوی نے پہلے راوی کے اور تیسرے

راوی نے دوسرے راوی کے اور چوتھے راوی نے تیسرے راوی کے بیان کو اپنے لفظوں میں بیان کیا اور علی ھذاالقیاس" پس حدیث کی کتابوں میں جو حدیثیں لکھی گئی ہیں وہ آخیر راوی کے لفظ ہیں اور معلوم نہیں ہوتا کہ اس درمیان میں اصلی الفاظ سے کس قدر لفظ ادل بدل اور الٹ پلٹ ہو گئے اور کچھ عجب نہیں کہ کسی نے حدیث کے اصل مطلب کو سمجھنے میں بھی غلطی کی ہو اور اصلی حدیث کا مطلب بھی بدل گیا ہو اور اس کے یعنی غلط مطلب سمجھنے کی مثال متعدد حدیثیں بھی موجود ہیں۔ خود صحابہ نے حدیث "سماع موتی" اور حدیث "تعذیب المیت ببکاء اھلہ" کا مطلب غلط سمجھا تھا" (۹)۔

سرسید کا یہ اعلان بھی بہت جرأت مندانہ ہے کہ تاریخ حدیث سے زیادہ معتبر ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو واقعہ کسی زمانہ میں گزرتا ہے بشرطیکہ وہ واقعہ ایسا ہو کہ آئندہ زمانہ کے لوگ اس کے تذکرہ میں مشغول رہتے ہوں اور اس کا چرچا قائم رکھتے ہوں تو جس قدر زمانہ گزرتا ہے اسی قدر اس میں زائد باتیں جو اس واقعہ میں درحقیقت نہیں ہوئیں ملتی جاتی ہیں۔ دنیاوی واقعات میں ایسا کم ہوتا ہے بلکہ نہیں ہوتا کہ آئندہ زمانہ کے لوگ مدت دراز تک اس کے تذکرے اور چرچے میں مشغول رہتے ہوں اور یہی سبب ہے کہ تاریخی واقعات میں جو بادشاہوں اور سلطنتوں اور ملکوں کے حالات میں لکھے جاتے ہیں ایسی زائد اور بے اصل باتوں کا میل کمتر ہوتا ہے مگر واقعاتِ مذہبی ایسے قسم کے ہوتے ہیں جن کا تذکرہ اور چرچا زمانہ دراز تک قائم رہتا ہے بلکہ برابر چلا جاتا ہے اس لئے زائد اور بے اصل باتیں ان واقعات میں شامل ہوتی جاتی ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ محدثین نے خدا ان پر رحمت کرے جہاں تک ان سے ہو سکا کسی نے کم اور کسی نے بہت زیادہ اس بات میں کوشش کی کہ صحیح روایتوں کو اپنی کتاب میں جمع کریں۔ لیکن اس بات کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ جس قدر حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کی بنیاد زبانی روایتوں کے سلسلے پر مبنی ہے۔ ان کی کوشش کا زیادہ تر بلکہ بالکلیہ راویوں کے معتبر اور نامعتبر ہونے کو اس طرح پر تحقیق کرنا جس پر یقینِ کامل ہو اگر ناممکن نہ تھا تو نہایت مشکل ضرور تھا مگر اس حدیث کے مضامین کے لحاظ سے اس کے نتائج صحیح یا غیر صحیح ہونے پر ان لوگوں کو کچھ خیال نہ تھا۔ اس زمانہ میں جس قدر مذاہب موجود تھے۔ سب کے سب سپر نیچرل (SUPER NATURAL) یعنی مافوق الفطرت واقعات کے واقع ہونے کے قائل تھے۔ مسلمان خدا کو قادرِ مطلق یقین کرتے تھے جن سے ان کا یہ مقصد تھا کہ خدا ایسے امور کے کرنے پر بھی مختار ہے جو مافوق الفطرت ہوں۔ اس لئے ہر قسم کے مافوق الفطرت

واقعات کو بھی حدیثوں کی کتابوں میں داخل کر لیا جاتا تھا۔ اس مرحلہ پر سرسید ایک سوال پوچھتے ہیں :" ایک محقق کو جو یہ چاہتا ہو کہ ان حدیثوں اور روایتوں میں صحیح کو غیر صحیح سے تمیز کرے اور عقلاً بغیر پابندی مذہب کے کیا کرنا لازم ہے"۔ ؟ عقل یہ حکم کرتی ہے کہ سب سے اوّل اس کا یہ کام ہو گا کہ اسی زمانہ کی ایسی تحریر کو تلاش کرے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہو لکھا ہو تاکہ اس سے ان زبانی روایتوں کا مقابلہ کرے اور جس زبانی روایت کو اس تحریر کے مخالف یا متناقص پائے اس کو غلط قرار دے۔ ایسی تحریریں بجز قرآن مجید کے اور کہاں مل سکتی ہیں ؟ وہ پوچھتے ہیں۔

سرسید حدیث کو اس وقت تک ماننے کے لئے تیار نہیں جب تک وہ درایت کی کسوٹی پر پوری نہ اُترے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں ایک فرقہ ہے جو اپنے تئیں اہل حدیث کہتا ہے اور اس کے مخالف اس کو وہابی کہتے ہیں۔ وہ فرقہ تقلید کا منکر اور عمل بالحدیث کا قائل ہے مگر وہ بھی تقلید میں پھنسا ہوا ہے اس لئے کہ اس نے حدیث مجتمعہ میں درایت کو چھوڑ دیا ہے بلکہ اس کو حرام سمجھتا ہے اور حدیثوں کی نسبت اگلے لوگ جو کچھ لکھ گئے ہیں اس کی تقلید کرتا ہے اور جس قدر لوگوں کی مقلدین ائمہ مجتہدین تقلید کرتے ہیں اس سے بہت زیادہ لوگوں اور راویوں کی یہ فرقہ تقلید کرتا ہے۔

احادیث کے متعلق ان کا آخری فیصلہ یہ ہے کہ سوائے ان احادیث کے جن میں ذکرِ آخرت ہو کسی حدیث پر عمل کرنا اُمتِ مسلمہ پر فرض نہیں، ایک جگہ وہ لکھتے ہیں کہ" سوائے ذکرِ آخرت کے باقی تمام باتیں تبلیغِ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتیں۔ ہم آنحضرتؐ کے تمام افعال واقوال کا نہایت ادب کرتے ہیں اور ان کو مقدس اور نہایت نیک خصال اور پاک اقوال اور افعال سمجھتے ہیں مگر رسالت سے ان کو کچھ تعلق نہیں"۔(۱۲)

صاف ظاہر ہے کہ اُنہوں نے اہلِ قرآن کا موقف اختیار کیا ہے جو حدیث کے منکر ہیں۔ حدیث کا انکار کرنے کے لئے سرسید کی خاص توجیہہ یہ ہے کہ خود جناب پیغمبرِ خداؐ نے ہم کو ھدایت کی ہے کہ سوائے قرآن مجید کے ان کا تمام کلام وحی نہیں ہے بلکہ وحی وہی ہے جو تبلیغِ رسالت سے علاقہ رکھتی ہے اور جس کی نسبت خود جناب پیغمبرِ خداؐ نے ان کا وحی سے ہونا بیان فرما دیا ہے یا ان میں ایسے اُمور بیان ہیں جو عقائدِ مذہبی، اخلاق، عالمِ عقبیٰ اور روح کے حالات سے علاقہ رکھتے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ بغیر وحی کے معلوم نہیں ہو سکتے۔ مذکورہ بالا اقسام کے سوا باقی کلام آنحضرتؐ کا وہ ہے جو تبلیغِ رسالت سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا۔ اس طرح سرسید حدیث کو کوئی مذہبی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں سوائے ان

چند احادیث کے جن میں ذکرِ آخرت ہے یا جن کا واسطہ اخلاقی مسائل یا مذہبی عقائد سے ہے (۱۳)۔

جہاں تک مسلم فقہ کا تعلق ہے سرسید اسے بالکلیہ مسترد کر دیتے ہیں بقول ان کے اگلے زمانہ کے نیک اور متدین مگر مذہب کی طرف زیادہ متوجہ عالموں نے یہ خیال کیا کہ جہاں تک ہو سکے ہر ایک کام کسی مذہبی سند پر کیا جائے۔ پس جو واقعہ یا امر پیش آتا اس کے لئے فکر کرتے کہ اس کو کسی مذہبی سند سے متعلق کریں اور پھر خواہ مخواہ کھینچ تان کر اور تاویلات واستدلات دور از کار کر کے کسی نہ کسی سند سے متعلق کر دیتے تھے۔ یا کسی اصولِ عام کے جس کو خود انہیں نے قائم کیا تھا تابع کر دیتے تھے۔ ان علماء کے اقوال واستدلات رفتہ رفتہ مدوّن ہونے لگے جن کی بدولت کتبِ فقہ و اصول فقہ ہمارے ہاں پیدا ہو گئیں۔ اس زمانہ میں تمام لوگ ان علمار کے اقوال واستدلال کو ایک رائے سے زیادہ رتبہ کا نہیں سمجھتے تھے مگر رفتہ رفتہ خود ان علمأ کے اقوال بطور سند کے تصوّر ہونے لگے اور پھر ایک زمانہ کے بعد وہی مذہبِ اسلام سمجھا گیا اور شرع اس کا نام ہو گیا (۱۴)۔

سرسید لکھتے ہیں کہ "اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام لوگوں کے خیالوں میں یہ غلط مسئلہ جم گیا کہ مذہبِ اسلام تمام دنیاوی اُمور سے بھی متعلق ہے اور کوئی دنیاوی کام بے سند یا اجازتِ مذہبی کے نہیں کیا جا سکتا۔ علمار کے یہ فیصلے جو اجتہاد اور قیاس پر مبنی تھے اور جن میں حالاتِ وقت عادتِ اہلِ زمانہ یا رواجِ ملک کا خیال رکھا گیا تھا اگر وہ رتبہ میں بطور رائے ایک عالم یا جج یا مفتی و قاضی کے رہتے تو کچھ نقصان نہیں تھا مگر نقصان یہ ہوا کہ وہ عین مذہبِ اسلام قرار پا گئے اور سوائے پیغمبر صلعم کے اور بہت سے لوگوں کو مرتبہ شارع ہونے کا مل گیا۔

جب یہ خیال جما کہ مسائلِ مذکورہ عین مذہبِ اسلام ہے تو ضرور ہوا کہ اس کو کافی اور کامل سمجھا جاوے۔ اس خیال نے اس بات پر مائل کیا کہ کتبِ فقہ واسطے سیاستِ ملکیہ کے بالکل کافی ہیں اور اب ہم کو نہ سول کوڈ (CIVIL CODE) کی ضرورت ہے نہ سول پروسیجر (CIVIL PROCEDURE) کی۔ نہ کرمنل کوڈ (CRIMI-NAL CODE) کی ضرورت ہے نہ کرمنل پروسیجر (CRIMINAL PROCEDURE) کی۔ نہ ریونیو کوڈ (REVENUE CODE) کی ضرورت ہے اور نہ ٹریڈ کوڈ (TRADE CODE) کی۔ حالانکہ کتبِ موجودہ فقہ ان میں سے ایک کے لئے بھی کافی نہیں ہیں۔ ان تمام نقطوں نے کل سلطنت ہائے اسلامیہ کو ڈبو دیا اور غارت و برباد کر دیا" (۱۵)۔

اب ہم سرسید کے دوسرے قسم کے مذہبی خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ یہاں وہ بڑے تجدد پسند نظر آتے ہیں اور اہلِ قرآن کے منصب سے ہٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ایک رسالہ کا ذکر کرتے ہوئے جو انہوں نے وہابیت کے زیرِ اثر لکھا تھا اور جس کا نام "راہِ سنت" رکھا تھا وہ لکھتے ہیں :" یہ رسالہ دو قسموں پر منقسم ہے۔ ایک وہ جو عقاید و عبادات سے علاقہ رکھتی ہیں جس کو میں اب مذہب کہتا ہوں۔ دوسری جو عادت سے اور باتوں سے جو دنیاوی اُمور سے متعلق ہیں علاقہ رکھتی ہیں جیسے کھانا، پینا، پہننا، معاملہ کرنا وغیرہ اُمورِ تمدن معاشرت، پس جو کچھ میں نے عقائد و عبادات کی نسبت لکھا ہے اس کو اب بھی میں ویسا ہی برحق سمجھتا ہوں جیسا کہ جب سمجھتا تھا۔ باقی اُمورِ معاشرت و تمدن کو جو میں نے مذہب میں شامل کر دیا ہے اس کو صحیح نہیں سمجھتا بلکہ بڑی غلطی جانتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائے تعلیم سے یہ خیال جا ہوا تھا کہ مذہب دین و دنیا دونوں سے علاقہ رکھتا ہے اور جب یہ رسالہ لکھا اس وقت بھی یہی خیال تھا پس دین و دنیا دونوں کی باتیں اس میں ملا دیں۔ بہت غوروں اور فکروں اور اونچ نیچ سمجھنے اور خدا اور خدا کے رسولؐ کے احکام پر خوب فکر کرنے کے بعد دونوں میں تفرقہ معلوم ہوا ہے اور یہ غلطی جو اس رسالہ میں ہوئی ہے کھلی ہے۔ میں نہایت خوشی سے اقرار کرتا ہوں اور یقین جانتا ہوں کہ دینی اور دنیاوی اُمور میں تفرقہ نہ کرنا اور دونوں کو برابر مذہبی احکام سمجھنا درحقیقت ایک بڑی غلطی ہے" (۱۶)۔

اس بیان سے یہ منتزع ہوتا ہے کہ سرسید کے دوسرے دور کے خیالات کے مطابق مذہب اور اسلام کا محض عقاید اور عبادات سے تعلق ہوتا ہے اور زندگی کے دوسرے میدانوں کا دنیاوی افعال و اعمال سے۔ ہاں اخلاق کو وہ مذہب سے جدا نہیں سمجھتے۔ یہ بات ان کے حسبِ ذیل بیان سے ظاہر ہے :-

" دنیا میں دو قسم کے اُمور ہیں۔ ایک روحانی اور دوسرے جسمانی۔ یا یُوں کہو کہ ایک دینی اور دوسرے دنیاوی۔ سچا مذہب امورِ دنیاوی سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ ہاں چند معظم باتوں کو جن کا اثر اخلاق پر زیادہ تر ہے اور گو وہ دنیاوی ہوں بیان کر دیتا ہے" (۱۷)۔ "کچھ شبہ نہیں ہے کہ اسلام بھی جو بے شک ایک سچا مذہب ہے انہیں اصول پر مبنی ہے اور ہمارے رسولِ مقبولؐ کا یہ قول کہ " ما آتاکم من امر دینکم فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتھوا " اس پر دلیلِ کامل ہے" (۱۸)

سرسید مذہب کو ذاتی عقائد تک محدود سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پائے گا۔ ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا۔ انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر سے الفاظ میں یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں۔ اس کے عقائد کی

جو کچھ بھلائی یا بُرائی ہو اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے ۔ نہ بھائی اس میں شریک ہے نہ بیٹا ۔ نہ دوست نہ آشنا اور نہ قوم ۔ پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کچھ تعلق نہیں ہے ۔ کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیئے ۔ ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنّی ، وہابی ہے یا بدعتی ، لامذہب ہے یا مقلد یا نیچری یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے جبکہ وہ خدا و خدا کے رسولؐ کو برحق جانتا ہے ۔ کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیئے بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمہ کا شریک سمجھنا اور اس اخوّت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے قائم رکھنا چاہیئے ...... جو حصہ کہ انسان میں اس کے ابنائے جنس کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیئے اور وہ حصہ آپس کی محبتِ باہمی ، دوستی ، ایک دوسرے کی اعانت ایک دوسرے کی ہمدردی ہے جس کے مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے (۱۹) ۔

سرسید نے ان خیالات کا اظہار وہاں کافی واضح طور پر کیا ہے جہاں وہ رسول اللہؐ کے سیاسی اور انتظامی امور کا ذکر کرتے ہیں ۔ ان کی یہ قطعی رائے ہے کہ حالانکہ عربوں نے رسول اللہؐ کے دور میں بڑی سماجی ترقی کی مگر سماجی ترقی رسول اللہؐ کے مشن کا حصہ نہیں تھی ۔ وہ لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلعم کا کام صرف اسپریچوئل ورچو (SPIRITUAL VIRTUE) یعنی روحانی نیکی کا بتانا تھا اور جہاں تک اس کا تمدّن سے تعلق تھا بطور لزوم کے تھا نہ بطور مقصود بالذات کے ...... آنحضرت صلعم نے روحانی اخلاق کو کافی ترقی دی ...... باقی رہی تمدّنی حالت ۔ وہ ان کے اصلی کام کی جس پر وہ کھڑے ہوئے جزو نہ تھی گو اس میں بھی بہت کچھ ترقی ہوئی ۔ ملکی انتظام محض ایک دنیاوی کام تھا جہاں تک جان و مال کے امن سے متعلق اور اس زمانہ کی حالت کے مطابق بطور ایک دنیاوی کام کے نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچا تھا اور آئندہ کے لئے وہ یہ انتظام فرما کر کہ "انتم اعلم بامور دنیاکم" ان لوگوں کے ہاتھوں چھوڑا تھا جو آئندہ زمانہ میں ہوں ۔ یہ ایک نہایت غلطی ہے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی اُمور اور انتظام ملکی بھی ایک جزو پیغمبری کا تھا (۲۰) ۔

سرسید کے خیال کے مطابق آنحضرت صلعم کو موسیٰ علیہ السلام سے بھی زیادہ سخت مجبوری دنیاوی اُمور میں بھی سرداری اختیار کرنے کو پیش آئی تھی جس کو منصب نبوت سے کچھ تعلق نہ تھا ۔ عرب کی تمام قوموں کا یہ طریقہ تھا کہ جس کو شیخ یا سردارِ قوم قرار دیتے تھے تمام دنیاوی اُمور میں بھی اسی کی اطاعت کرتے تھے اور اسی کے حکم پر چلتے تھے ۔ پس بطور قدرتی امر کے ضروری تھا کہ تمام قوم عرب پر آنحضرت صلعم کو اپنی دنیاوی سرداری اختیار کرنی بھی لازمی تھی مگر جس طرح کہ حضرت موسیٰؑ میں دو منصب جدا جدا جمع ہو گئے تھے اسی طرح آنحضرت صلعم

میں بھی دو جداگانہ منصب جمع تھے (۲۱)۔ جہاں تک دنیاوی سرداری کا تعلق ہے آنحضرت صلعم بھی مثل حضرت موسیٰؑ کے اپنے صحابہ کے مشورے سے اور ضرورت و مصلحتِ وقت کے لحاظ سے احکام صادر فرماتے تھے اور مسلمانوں نے یا تو یہودیوں کی پیروی سے یا اسی لازمی نتیجے سے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے آنحضرت صلعم نے بھی دنیاوی اُمور کی نسبت جو کچھ کیا یا فرمایا بطور ربانی احکام کے سمجھا اور رسول اللہؐ کے واضح ارشاد، "وانتم اعلم بامور دنیاکم" کو یک لخت بھلا دیا (۲۲)۔

سرسید اس بات پر زور دیتے ہیں کہ انسانوں کی بدبختی کی جڑ دنیوی مسائل کو دینی مسائل میں جو ناقابلِ تغیّر و تبدل ہیں شامل کر لینا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کے اس قول کی دلیل دنیا کی تمام قوموں کی تاریخ میں پائی جاتی ہے۔ عیسائی قومیں جو اب دنیا میں اعلیٰ درجے کی خیال کی جاتی ہیں جب تک اس خیال میں مبتلا رہیں روز بروز نکبت کو پہنچتی گئیں۔ جیسا کہ اس زمانہ کی تاریخوں سے ثابت ہوتا ہے۔ ہندو جو ایک زمانے میں دنیا کی لائق قوموں میں تھے اسی آفت سے تباہ و برباد ہو گئے۔ مسلمان جو ایک زمانہ میں سب سے سربرآوردہ تھے اسی بدبختی کی ذلت میں مبتلا ہوئے۔ آخر نتیجہ ان کی بربادی کا جو ابھی سلطنت عثمانیہ ٹرکی پر گزرا، ہم نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا (۲۳)۔

سرسید کے خیال کے مطابق دنیوی مسائل کو دینی مسائل میں شامل کرنے کی غلطی لوگ بالعموم اس لئے کرتے ہیں کہ انہیں یہ خیال پیدا ہوتا کہ ان اُمور معاشرت کو جو عمدہ ہوں بطور مذہبی مسائل کے مذہب میں شامل کر لینا ان کے دوامی استحکام اور دوامی عمل درآمد کا باعث ہوتا ہے مگر اس خیال میں اُنہوں نے غلطی کی ہے۔ دینی احکام کا نیچر دنیاوی احکام معاشرت کے نیچر سے بالکل مختلف ہے۔ دینی احکام جو روحانی اخلاق اور روحانی تہذیب سے علاقہ رکھتے ہیں دوامی و ناقابلِ تبدیل ہوتے ہیں۔ برخلاف امورِ معاشرت و تمدن کے جو روز بروز تبدیل ہوتے جاتے ہیں (۲۴)۔

قرآن مجید کا ذکر کرتے ہوئے سرسید لکھتے ہیں کہ اس کا ہر ایک لفظ احکام مذہبی سے علاقہ نہیں رکھتا۔ اگر بعض مفسرین کی رائے سے اتفاق کر لیا جائے تو قرآن مجید میں صرف پانسو آیاتِ احکام ہیں اور درحقیقت اتنی بھی نہیں۔ پس دنیاوی اُمور کا قرآن مجید میں ذکر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ دنیاوی معاملات بھی مذہب میں داخل ہیں (۲۵)۔

سرسید سیاست کو مذہب سے بالکل جدا چیز سمجھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا

کہ مسلمانوں نے امورِ متعلق سیاست کو الہامی سمجھا ہو۔ خود پیغمبرِ خداؐ اپنے زمانہ میں ایسے امور میں صحابہ سے صلاح لیتے تھے اور اس صلاح کے مطابق کاربند ہوتے تھے۔ اس زمانہ کے بعد بھی ان روایتوں کو جو سیاست سے متعلق تھیں کسی نے الہامی نہیں سمجھا........ قرآن مجید اور نیز جناب پیغمبرِ خداؐ نے ہر چیز متعلق سیاست اور انتظامِ مدن کو باستثنائے چند اصولِ عام کے بالکل فرماں رواؤں کی رائے پر چھوڑ دیا ہے اور صرف یہ حکم دیا ہے کہ ذی فہم لوگوں سے مشورہ کر کے کام کریں جو زمانہ کے حالات اور ڈھنگ کے واسطے ضروری ہیں (۲۶)۔

سرسیّد کے مذہبی خیالات میں ایک بنیادی تصور یہ ہے کہ ہماری کائنات کا نظام علت و معلول کے ایک سلسلہ میں جکڑا ہوا ہے۔ ان کی نیچریت۔ ان کی عقلیت اور کائناتی جبریت پر ان کا عقیدہ سب ان کے طبعی تعلیل (NATURAL CAUSATION) کے بنیادی اعتقاد پر مبنی ہیں۔ خدا کے بارے میں ان کا نظریہ یہ ہے کہ وہ علت العلل ہے۔ وہ لکھتے ہیں ،، تمام موجودات کا خالق یا ان کے وجود کا سبب آخیر یا علت العلل کوئی ہے اور اسی کا نام اللہ ہے۔

مذہب اسلام کا سب سے پہلا یہ عقیدہ ہے کہ تمام کائنات کا کوئی خالق ہے۔ یہ سب کچھ جو موجود ہے اور جس کو ہم کسی طرح جان سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں یا خیال کر سکتے ہیں ایک ایسے سلسلے سے مربوط ہے کہ ایک کا وجود دوسرے پر اور دوسرے کا تیسرے پر منحصر ہے۔ پس ضرور ہے کہ یہ سلسلہ کسی اخیر وجود یا علت یا سبب پر منتہی ہو اور جس پر یہ منتہی ہو وہی خالق اور خدا اور رب العالمین ہے (۲۷)۔

سرسید وجودِ باری تعالیٰ کو مادہ کے ناقابلِ عدم ہونے سے ثابت کرتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ تمام چیزیں جو بوجودِ حقیقی موجود ہیں نہ ممتنع ہیں نہ قابلِ عدم۔ اگر وہ ممتنع ہوتیں تو موجود کیوں ہوتیں اور اگر قابلِ عدم ہوتیں تو کبھی غیر موجود بھی ہوتیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی موجودِ حقیقی کبھی معدوم نہیں ہوتا صرف عوارض یا صُوَر کا تبدل ہوتا رہتا ہے۔ پانی ہوا ہو جاتا ہے۔ ہوا پانی بن جاتی ہے .... غرض کہ کوئی شے معدوم نہیں ہوتی۔ صرف عوارض یا صورت کا ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ پس اگر تمام موجودات کے عوارضِ نوعیہ یا شخصیہ معدوم ہو جاویں تو جو کچھ باقی رہے گا وہ ناقابلِ عدم ہوگا۔ وہی ناقابلِ عدم وجود اللہ ہے۔

اللہ بس۔ باقی ہوس (۲۸)۔ وقد قال اللّٰہ تبارک تعالیٰ کل من علیھا فان و یبقی وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔ اسی علت العلل کا نام اللہ ہے۔

سرسید اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ تمام موجودات کے عوارض نوعیہ یا شخصیہ معدوم ہو جانے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ واحد ہو گا یا متعدد۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ تمام موجودات کے عوارض نوعیہ و شخصیہ کے معدوم ہونے کے بعد جو وجود ناقابلِ عدم باقی رہے گا۔ اگر وہ متعدد ہیں تو ان میں معاونت کی علت مشترک کوئی اور وجود ہو گا اور اسی وجود کو ہم کہتے ہیں اللہ۔ اگر وہ واحد ہے اور قبول عوارض کی قوت خود اسی میں ہے تو اسی کا نام اللہ ہے اور اگر دوسرا وجود اس کی علت ہو تو اسی علت العلل کا نام اللہ ہے (۲۸)۔

خدا کے متعلق سرسید کا تصور یہ ہے کہ وہ احکم الحاکمین ہے جو خود اپنے تصنیف کئے ہوئے دستور کا اپنے آپ بھی پابند ہے وہ سب باتیں قانونِ قدرت کے مطابق کرتا ہے اس کا قانونِ قدرت کبھی ٹوٹتا نہیں۔ وہ ہر طرح کے قانونِ قدرت کے بنانے پر قادر ہے مگر جو قانونِ قدرت کہ اس نے بنا دیا پھر اس کے برخلاف کچھ ہوتا نہیں۔ وہ قدرت کے قانون بنانے میں کسی سبب کا محتاج نہیں۔ بدیع السمٰوات والارض قضی امرا فانما یقول لہ کن فیکون۔ امر کے لفظ سے وہی قانونِ قدرت مراد ہے جس کو بغیر کسی سبب کے صرف کُن کے لفظ سے یعنی ارادہ سے جو مقتضائے کمال ہے بنا دیتا ہے۔ اس کے سوا کوئی حاکم نہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اندھا دھوندی سے لغو و بے فائدہ احکام جاری کرنے لگے۔ پس یہ اعتقاد رکھنا کہ حسن و قبح اشیاء کی اور کسی فعل پر ثواب یا عقاب ہونا صرف خدا کے حکم اور اس کے امر و نہی کے سبب سے ہے محض لغو اعتقاد ہے بلکہ حسن و قبح اشیاء کی اور کسی فعل پر ثواب و عقاب کا ہونا اسی قانونِ قدرت پر مبنی ہے اور خدا کے احکام اسی قانونِ قدرت کا بیان ہے پس ان میں سے بعض تو ایسے ہیں کہ ان کے حسن و قبح کو ابتداً ہی عقل انسانی کی دریافت کر لیتی ہے اور بعض ایسے ہیں۔ بعد الاخبار من الرسل عن اللہ تعالیٰ۔ ان کے حسن و قبح کو عقل تسلیم کرتی ہے (۲۹)۔ (مسلسل)

حواشی وحوالجات

(۱) مقالاتِ سرسید مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی جلد ۱۰ ص ۵۰ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً جلد ۱ ص ۹۲۔ (۴) ایضاً۔ (۵) ایضاً جلد ۱ ص ۳۷۔ (۶) ایضاً جلد ۱ ص ۸۰ (۷) حیاتِ جاوید مصنفہ حالی پانی پتی ص ۲۷۲۔ (۸) محمد اسمٰعیل پانی پتی محولہ بالا جلد ۱ ص ۱۷۸۔ (۹) ایضاً جلد ۱ ص ۴۸-۴۹۔ (۱۰) ایضاً جلد ۱ ص ۹ تا ۲۵ (۱۱) ایضاً جلد ۱ ص ۲۷۔ (۱۲) ایضاً جلد ۹ ص ۳۸۵۔ (۱۳) ایضاً جلد ۹ ص ۳۸۲۔ (۱۴) ایضاً جلد ۹ ص ۱۱۔ (۱۵) ایضاً جلد ۹ ص ۱۲۔ (۱۶) ایضاً جلد ۵ ص ۴۲۸-۴۲۹۔ (۱۷) ایضاً جلد ۹ ص ۱۔ (۱۸) ایضاً۔ (۱۹) ایضاً جلد ۵ ص ۱۶۹-۱۷۰۔ (۲۰) ایضاً جلد ۱ ص ۲۷۴ (۲۱) ایضاً جلد ۵ ص ۴۔ (۲۲) ایضاً۔ (۲۳) ایضاً جلد ۵ ص ۵-۶۔ (۲۴) ایضاً جلد ۵ ص ۹۔ (۲۵) ایضاً جلد ۵ ص ۸-۹۔ (۲۶) ایضاً جلد ۱۱ ص ۱۴۱۔ (۲۷) ایضاً جلد ۱ ص ۹-۱۰۔ (۲۸) ایضاً جلد ۱ ص ۹ اور ۱۱۔ (۲۹) ایضاً جلد ۱۳ ص ۴۔